

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزان، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

امتحانی مشق نمبر 2

(پونٹ 95 تا 9)

- (20) سوال 1- دہستانِ دہلی کی شاعری کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے؟ وضاحت کریں۔
- (20) سوال 2- دہستانِ لکھنؤ کی نمائندہ شعری اصناف پر مفصل نوٹ لکھیں۔
- (20) سوال 3- اردو ادب کے لیے جان گل کرست کی خدمات کا جائزہ پیش کریں۔
- (20) سوال 4- حالی کی "مسدس" مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان ہے؟ بحث کریں۔
- (20) سوال 5- اسلامی ادب کی تحریک کے وجود میں آنے کے کیا اسباب تھے؟ وضاحت کریں۔

ANS 01

اور غنزیب کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا معظم تخت نشین ہوا لیکن اس کے بعد معظم کے بیٹے معز الدین نے اپنے بھائی کو ٹکست دے کر حکومت بنائی۔ معز الدین کے سبقتیجے "فرخ سیر" نے سید برداران کی مدد سے حکومت حاصل کی لیکن سید برداران نے فرخ سیر کو بھی ٹھکانے لگادی۔ اس طرح 1707ء سے لے کر 1819ء تک دہلی کی تخت پر کئی بادشاہ تبدیل ہوئے۔ محمد شاہ رنگیلا عیاشی کے دور میں نادر شاہ درانی نے دہلی پر حملہ کر دیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ پھر احمد شاہ عبدالی کے حملے نے مزید کسر بھی پوری کر دی۔ دوسری طرف مرہٹے، جات اور روہیلے آئے دن دہلی پر حملہ آور ہوتے اور قتل عام کرتے اس دور میں کئی بادشاہ بدالے اور مغل سلطنت محدود ہوتے ہوئے صرف دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اور آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے ممزول کر کے رنگوں بھیج دیا۔ یہ تھی دہلی کی مختصر تاریخ جس میں ہماری اردو شاعری پرداز چڑھی۔ یہ ایسا پر آشوب دور تھا جس میں ہر طرف بد نظمی، انتشار اور پستی کا دور دورہ تھا۔ ملک میں ہر طرف بے چینی تھی۔

زبان میں فارسیت:-

دہستانِ دہلی کے شعراء کے ہاں فارسیت کا بہت غالب تھا کیونکہ شعراً دہلی فارسی کی شعری روایت سے متاثر تھے اور ان پر فارسی شعراء کا گہر اثر تھا۔ ایران سے جو شعراء آتے تھے ان میں سے اکثر یہاں ہی رہ جاتے تھے۔ چنانچہ، خسرہ، حسن، عرفی، نظری، طالب، صائب اور بیدل وغیرہ مختلف ادوار میں یہاں رہے۔ اس کے علاوہ یہاں

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزانہ، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

فارسی شعراء کی زبان تھی۔ نیز یہاں کے شعراء اردو اور فارسی زبانوں میں دسترس رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی اسالیب و موضوعات وغیرہ دہلی کے دیستان شاعری میں شامل ہو گئے۔ اس طرح بہت سے شعراء نے فارسی شعراء سعدی، وحافظ کا ترجمہ کیا۔ اور خزانہ اردو کو مالا مال کیا۔ اس طرح دیستان دہلی کی شاعری میں فارسیت کا غالبہ ہے۔

جباتِ عشق کا اظہار:-

دب ست ان دہلی کے شعراء کے وال جذبات و احساد اسات کے اظہار پر زیادہ زور ہے۔ دب ست ان دہلی کے شعراء کے عذر کو اس بات کی پروانیں تھیں کہ ان کا اسلوب بیان اور طرزِ اخوب تر ہو بلکہ ان کی کوشش تھی کہ شاعری میں جذبات و احساس کا اظہار ہو جائے۔ اس لئے بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا شاعر کو عشق سے عشق ہو گیا ہے۔ دہلی کے کچھ شعراء عشقِ مجازی سے گزر کر عشقِ حقیقی سے سرشار ہوئے۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے لوگائی اور فیضانِ عشق کی بدولت ان میں ایسی بصیرت پیدا ہوئی کہ وہ تمام بی نواع انسان سے محبت کرنے لگے۔ جبکہ کچھ لوگ عشقِ مجازی کی منزل پر رک گئے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں محبت کا سوز اور ترپ موجود ہے۔ جبکہ کچھ لوگ نفس پر قابو نہ پاسکے اور وہ ابو یہوسی میں مبتلا ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ دہلی میں عشق کے یہ تینوں مدارج موجود ہیں۔ مثلاً درد جیسے شاعروں نے صوفی شاعری کی اور عشقِ حقیقی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

قاد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے

اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نہیں روز

آپ ہی ہونظارہ سوز پر دے میں منہ چھپائے کیوں

عشقِ مجازی:-

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

عشق کا دوسرا انداز جو دہلی میں بہت مقبول ہوا اس میں عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کے جذبات بھی شامل ہو گئے۔ یہ رنگ میر تھی میر نے بہت خوبی سے نبھایا۔ ان کے جذبہ عشق میں وہ خلوص اور گہرائی تھی جس نے ان کی شاعری کو حیات جاوہاں عطا کی۔ عشق کا یہ تینھا انداز دہستان دہلی سے مخصوص ہے۔ عشق مجازی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ جن میں دہلی کے تمام شعراء نے بڑی خوبصورتی سے ان جذبات کو شاعری کاروپ دیا ہے۔

پاس ناموس عشق تھا ورنہ

کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

حزن ویاس:-

دہستان دہلی کی شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت رنج و الم اور حزن ویاس کا بیان ہے۔ دہستان دہلی کی شاعری کا اگر بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ دہستان دہلی کی شاعری میں یاس و نامیدی کے جذبات بکثرت موجود ہیں۔ شاعر خواہ کسی موضوع پر بات کرے رنج و الم کا ذکر ضرور آجاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس سارے دور میں کسی کو اطمینان و سکون نصیب نہ تھا۔ زندگی ایک خواب پریشان بن کر رہ گئی تھی۔ ہر طرف نفسانگی کا عالم تھا۔ کسی شے کو ثابت نہ تھا۔ ان حالات کا شاعری پر بھی گھر انکس نظر آتا ہے۔ خارج میں تباہی و بر بادی پھیلی ہوئی تھی اور تباہی و بر بادی کے تاریک سائے شاعری میں بھی راہ پاتے ہیں۔ چنانچہ فنا کا احساس بہت تیز ہے۔ اس کے ساتھ اجڑے ہوئے شہر، لٹے ہوئے نگر اور ویران گزر گاہیں جام جام موجود ہیں۔ خصوصاً میر و سودا کے دور میں زندگی کی ناپائیداری کا احساس بہت شدت سے اظہار کی راہ پاتا ہے۔ چنانچہ حزن ویاس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثابت

گلی نے یہ سن کر تبسم کیا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور

یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزان، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

اس حزن و یاس کی فضاء کے بارے میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ

”ظاہر ہے دہلی کی شاعری یک سر جذبات کی زبان و گفتگو ہے اور جذبات بھی وہی ہیں جن کا تعلق زیادہ تر حرام و محرومی و ناکامی سے ہے۔“

تصوف:-

واردات قلبی کے اظہار کے بعد دہستان دہلی کے شعراً کا دوسرا محبوب ترین موضوع تصوف ہے۔ چونکہ ابتداء میں اردو شاعری پر فارسی شاعری کی شعری روایت کا بہت زیادہ غلبہ رہا ہے جس کی وجہ سے اردو شعراً نے غیر شعوری طور پر فارسی شاعری کے اسالیب، سانچے، اور موضوعات قبول کر لئے۔ دوسری طرف اس موضوع کو اس لئے بھی مقبولیت ملی کہ تصوف میں بھی قناعت، صبر و توکل اور نفی ذات کے نظریات نے زیادہ زور پکڑا کیونکہ اس زمانے کے حالات ہی ایسے تھے جن کی بناء پر لوگ ترک دنیا کی طرف مائل ہو رہتے تھے۔ اس زمانے میں یہ خیال عام تھا کہ تصوف برائے شعر گفتگو نوب است ان میں کچھ تصوفی شعراً تھے لیکن زیادہ تر شعراً نے محض رسی طور پر تصوف کے مضامین کو نظم کیا۔ چنانچہ ذوق اور غالب کے زمانے تک تقریباً ہر شاعر کے کلام میں تصوف کے مضامین نظر آتے ہیں۔ تصوف کی مقبولیت کا دوسرا سبب یہ تصورات و اقدار تھے جو ہندوستان کی فضاء میں رپے بے ہوئے تھے۔ جن کی بدولت انہوں نے تصوف کو موضوع بنایا۔

مسافر اٹھ تجھے چلتا ہے جانب منزل

بجے ہیں کوچ کا ہر دم نقادر شاہ حاتم

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ کیتا

جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

رمزیت اور اشاریت:-

تصوف کی بدولت اردو شاعری میں بڑی و سعت پیدا ہوئی چنانچہ بقول ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ”دہلی میں تصوف کی تعلیم اور درویشی کی روایت نے خیالات میں بلندی اور گہرائی پیدا کی اور اسلوب میں ممتاز و سنجیدگی کو برقرار رکھا۔ تصوف کے روایات نے شاعری کو

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

ایک اخلاقی لب ولہجہ دیا اور اپنداں سے دور رکھا۔

مسائل تصوف نے اردو غزل کو مرزو کنایہ کی زبان دی، پیر مغاں، گل، بلبل، چمن، شمع، پروانہ، میکدہ، اسی طرح کی اور بہت سی علامتیں تصوف کے راستے اردو شاعری میں داخل ہوئیں۔ تصوف نے اردو شاعری کو فکری پہلو بھی دیا اور استغنا کا درس دے کر دربارداری سے الگ رکھا۔ مزاجوں میں خوداری اور بے نیازی پیدا کی۔ تصوف کی بدولت اردو شاعری میں جور مزیت اور اشارتہ آئی اس سے شعراء نے بہت فائدہ اٹھایا اور چند لفظوں میں معنی کی دنیا میں آباد کیں۔ ذیل کے اشعار دیکھئے کہ پردوں میں کتنے جہاں آباد کھائی دیتے ہیں۔

ساقی ہے اک قبسم گل، فر صت بہار

ظام بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کھیں

دام ہر موج میں ہے حلقة صد کام نہنگ

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے کو گہر ہونے تک

داخلیت:-

دہستان دہلی کی شاعری کا ایک اور نمایاں پہلو داخیلت ہے۔ داخیلت سے مراد یہ ہے کہ شاعر باہر کی دنیا سے غرض نہیں رکھتا بلکہ وہ اپنے دل کی واردات کا اظہار کرتا ہے۔ اگر باہر کی دنیا کے متعلق کچھ کہتا ہے تو اسے بھی شدید داخیلت میں ڈبو کر پیش کرتا ہے۔ یہ داخیلت دہلی کے ہر شاعر کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن اس سے یہ سمجھ لیں کہ شعراء دہلی کے ہاں خارجیت بالکل نہیں ہے۔ خارجیت بھی ہے۔ لیکن داخیلت میں واردات قلبی یعنی عشق و محبت کے مضامین اور ان مصائب کا بیان شعراء دہلی نے نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

پاس ناموس عشق تھا ورنہ

کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزان، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا

درد کی دوپائی درد لا دوپایا

واقعیت و صداقت:-

دبتانِ دہلی کی ایک خصوصیت واقعیت و صداقت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان شعراء کے ہاں مبالغہ و غیرہ کم ہے۔ ان شعراء نے مبالغہ سے زیادہ کام نہیں لیا اگرچہ مبالغہ کا استعمال شاعری میں برائیں ہے لیکن جس بھی کسی چیز کا استعمال حد سے تجاوز کر جائے تو پھر اسے مناسب و موزوں نہیں سمجھا جاتا۔ اسی طرح حد سے زیادہ مبالغہ شاعری کو مضمکہ خیز بنادیتا ہے۔ شعراءِ دہلی کے ہاں اعتدال پایا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ صداقت کے اظہار کے لئے پر تکلف زبان کو بھی موزوں سمجھا جاتا ہے۔

ہر گھڑی کان میں وہ کہتا ہے

کوئی اس بات سے آگاہ نہ ہو

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر

نمہب عشق اختیار کیا

لائی حیات آئے قضاۓ چلی چلے

اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

سادگی:-

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

شعراء دہلی کے ہاں زبان میں بھی سادگی، صفائی اور شستگی پائی جاتی ہے۔ شعراء دہلی نے جس طرح مضامین میں واقعیت و صداقت کو مد نظر رکھا ہے۔ اسی طرح زبان بھی سادہ اور عام فہم استعمال کی ہے۔ اگرچہ ان شعراء نے صنعتوں کا استعمال کیا ہے لیکن وہ صنعت برائے صنعت کے لئے نہیں ہے۔ اس کے بجائے ان شعراء نے معنوی حسن کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تشبیہ اور استعارے کا استعمال حد سے آگے نہیں بڑھتا۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں

ساری مستی ثراب کی سی ہے

اختصار:-

شعراء دہلی کے کلام میں جہاں زبان میں سلاست و رواني کا عصر نمایاں ہے وہاں اختصار بھی ہے۔ اس دور میں دوسری اصناف کے مقابلے میں غزل سب سے زیادہ نمایاں رہی ہے۔ اور غزل کی شاعری اختصار کی متفاضلی ہوتی ہے۔ اس میں نظم کی طرح تفصیل نہیں ہوتی بلکہ بات اشاروں کنایوں میں کی جاتی ہے۔ اس لئے ان شعراء کے ہاں اختصار ملتا ہے۔ نیز غزل کا مخصوص ایمانی رنگ بھی موجود ہے۔ یہاں کے شعراء اپنے دلی جذبات و احساسات کو جوں کا توں بڑی فکاری سے پر دے ہی پر دے میں پیش کر دیتے ہیں۔ اسی بات کا ذکر کرتے ہوئے محمد حسن آزاد لکھتے ہیں کہ : ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے خیالات دل پر گزرتے ہیں وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ اس واسطے اشعار صاف اور بے تکلف ہیں۔“

ہم نشیں ذکر پیدا کر کچھ آج

اس حکایت سے جی بہلتا ہے

دل مجھے اس گلی میں لے جا کر

اور بھی خاک میں ملا لایا بے

ANS 02

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

سال 1707ء اور نگزیب عالم گیر کی موت کے بعد مغل سلطنت کا شیر ازہ بکھر گیا۔ ان کے جانشین تخت کے لئے خود بڑنے لگے۔ ان نااہل حکمرانوں کی وجہ سے مرکز مزید کمزور ہوا۔ اور باقی کسر مرہٹوں، جاٹوں اور نادر شاہ افشار اور احمد شاہ ابد الی کے حملوں نے پوری کر دی۔ سال 1722ء میں بادشاہ دہلی نے سعادت علی خان کو اودھ کا صوبیدار منصوب کیا۔ مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلد ہی سعادت علی خان نے خود مختاری حاصل کر لی۔ اور اودھ کی خوشحالی کے لئے بھر پور جدوجہد کی جس کی بنابر اودھ میں مال و دولت کی فروانی ہوئی۔ صدر جنگ اور شجاع الدولہ نے اودھ کی آمدنی میں مزید اضافہ کیا اور عوام کی فلاج و بہبود کے لئے کوششیں کیں۔ آصف الدولہ نے مزید اس کام کو آگے بڑھایا۔ لیکن دوسری طرف دہلی میں حالات مزید خراب ہوتے گئے۔ امن و سکون ختم ہو گیا۔ تو وہاں کے ادباء و شعراء نے دہلی چھوڑنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اور بہت سے شاعر لکھنؤ میں جا کر آباد ہوئے۔ جن میں میر تقی میر بھی شامل تھے۔ دولت کی فروانی، امن و امان اور سلطنت کے استحکام کی وجہ سے اودھ کے حکمران عیش و نشاط اور رنگ ریوں کے دلداد ہو گئے۔ شجاع الدولہ کو عورتوں سے خصوصی رغبت تھی جس کی بناء پر اس نے محل میں بے شمار عورتوں کو داخل کیا۔ حکمرانوں کی پیروی امراء نے بھی کی اور وہ بھی اسی رنگ میں رفتگتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

بازاری عورتیں ہرگلی کوچے میں پھیل گئیں۔ غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر نے آباء و اجداد کی پیروی جاری رکھی اور واحد علی شاہ نے تو اس میدان میں سب کو مات دے دی۔ سلاطین کی عیش پسندی اور پست مذاقی نے طوائف کو معاشرے کا اہم جز بنا دیا۔ طوائف کے کوٹھے تہذیب و معاشرت کے نمونے قرار پائے جہاں پھوٹ کوشاںگی اور آداب محفل سکھانے کے لئے بھیجا جانے لگا۔

شعر و ادب پر اثرات

عیش و نشاط، امن و امان اور شان و شوکت کے اس ماحول میں فنون نے بہت ترقی کی۔ راگ رنگ اور رقص و سرور کے علاوہ شعر و شاعری کو بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ دہلی کی بد امنی اور انتشار پر اہل علم و فن اودھ اور خاص کر لکھنؤ میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ یوں شاعری کا مرکز دہلی کی بجائے لکھنؤ میں قائم ہوا۔ دربار کی سرپرستی نے شاعری کا ایک عام ماحول پیدا کر دیا۔ جس کی وجہ سے شعر و شاعری کا چرچا تنا پھیلا کہ جا بجا مشاعرے ہونے لگے۔ امراء، روئے ساء اور عوام سب مشاعروں کے دیوانے تھے۔ ابتداء میں شعرائے دہلی کے اثر کی وجہ سے زبان کا اثر نمایاں رہا لیکن، آہستہ آہستہ اس میں کمی آنے لگی۔ مصحفی اور انشاء کے عہد تک تو دہلی کی داخلیت اور جذبات نگاری اور

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزان، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

لکھنؤ کی خارجیت اور رعایت لفظی ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ لکھنؤ کی اپنی خاص زبان اور لب و لہجہ بھی نمایاں ہوتا گیا۔ اور یوں ایک نئے دبتان کی بنیاد پر ڈی جس نے اردو ادب کی تاریخ میں دبتان لکھنؤ کے نام سے ایک مستقل باب کی حیثیت اختیار کر لی۔

دبتان لکھنؤ

دلی اور لکھنؤ کے فرق اور امتیازات کو سب سے پہلے ناخنے متعین کیا اور ان خصوصیات کو اپنی شاعری میں ملحوظ خاطر رکھا شاید یہی وجہ ہے کہ ناسخ ہو دبتان لکھنؤ کا بانی کہا جاتا ہے۔ سید وقار عظیم نے لکھنؤی دبتان شعر کی مندرجہ ذیل خصوصیات قرار دی ہیں تکلف اور تضung، محسوسات کی سادگی اور واردات کی سچائی کی بجائے رُگینی اور فلکر کی باریک بینی۔ لفظی صنعت گری، دوراز کار استعارے اور تشبیہیں، سخت اور سنگلاخ زمینیں، پرشکوہ الفاظ اور تراکیب، دل کی بجائے دماغ سے تخاطب، لب و لہجہ میں بلکا پن جو بار بار بد مسٹی ہو سنائی پر منتج ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے باعتبار زبان لکھنؤی شاعری کی حسب ذیل امتیازی خصوصیات گنوائی ہیں:

عربی و فارسی الفاظ کا کثرت استعمال

قافیہ پیائی:

طویل غزل سے غزل کو فائدے کے بجائے یہ نقصان ہوا کہ بھرتی کے اشعار غزل میں کثرت سے شامل ہونے لگے۔ شعر انے زور کلام دکھانے کے لئے لمبی ردیفیں اختیار کرنی شروع کر دیں جس سے اردو غزل میں غیر مستعمل قافیوں اور بے میل ردیفوں کا رواج شروع ہوا۔ معمولی قافیوں اور ردیفوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس سے قافیہ پیائی کا رواج شروع ہوا۔ ذیل میں بے میل ردیفوں سے قافیوں کی چند مثالیں درج ہیں۔

انتہائی لا غری سے جب نظر آیا نہ میں

ہنس کر کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے

فوج لڑکوں کی جڑے کے دل نہ تڑا تڑ پتھر

ایسے خطی کو جو کھائے ہے کڑا کڑ پتھر

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

گلی غلیل سے ابرو کی، دل کے داغ کو چوٹ

پر ایسے ہی کہ لگے تڑ سے جیسے زاغ کو چوٹ

بات طویل غرموں اور، بے میل رہیوں اور قافیوں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ شعر الکھنونے اپنی قادر الکلامی اور استادی کا ثبوت دینے کے لئے سنگال خزمیوں میں بھی طبع آزمائی کی۔

طویل غزلیں:

لکھنؤی شاعری کی ایک اور نمایاں بات طویل غزلیں ہیں۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ ابتداء جرات مصھنی نے کی جودی دبتان سے تعلق رکھتے تھے۔ جودی کی تباہی کے بعد لکھنؤ جا بے تھے۔ لیکن لکھنؤی شعرا نے اس کو زیادہ پھیلایا اور بڑھایا اور اکثر لکھنؤی شعرا کے ہاں طویل غزلیں بلکہ دو غزلہ، اور سہ غزلہ کے نمونے ملتے ہیں۔ اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ لکھنؤ کے اس دور میں پر گوئی اور بدیہہ گوئی کو فن قرار دے دیا گیا تھا۔ نیز لوگ قافیہ بیانی کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے طویل غزلیں بھی لکھی جانے لگیں چنانچہ ۵۲۔۳۰۳۱۔ اشعار پر مشتمل غزلیں تو اکثر ملتی ہیں۔ بلکہ بقول ڈاکٹر خواجہ زکریا بعض اوقات اس سے بھی زیادہ طویل غزلیں بھی لکھی جاتی تھیں۔

نہایت:

ڈاکٹر ابوالیث صدیقی نے لکھنؤی دبتان کی شاعری کا ایک اہم عنصر نہایت بتایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ہر زمانے ہر قصہ اور ہر زبان میں، عورت، شاعری کا بڑا اہم موضوع رہا ہے۔ لیکن لکھنؤ کی سوسائٹی میں عورت کو اہم مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اس نے ادب پر بھی گھر اثر ڈالا۔ اگر یہ عورتیں پاک دامن اور عرفت ماب ہوتیں تو سوسائٹی اور ادب دونوں پر ان کا صحبت منداشت پڑتا لیکن یہ عورتیں بازاری تھیں۔ جو صرف نفس حیوانی کو انگیخت کرتی تھیں۔ جبکہ دوسری طرف عیش و عشرت اور فراغت نے مردوں کو مردانہ خصائص سے محروم کر کے ان کے مردانہ جذبات و خیالات کو کمزور کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کے جذبات خیالات اور زبان پر نہایت غالب آگئی۔ چنانچہ رینتہ کے جواب میں رنجتی تصنیف ہوئی۔ اس کا سہر اعام طور پر سعادت یار خان رنگین کے سر باندھا جاتا ہے۔ رنگین کے بعد انشا اور دوسرے شعرا نے بھی اسے پروان چڑھایا۔ ان شعرا کے ہاں رنجتی کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں عورتوں کے فاحشانہ جذبات کو ان کے خاص محاوروں میں جس طرح ان لوگوں نے نظم کیا ہے وہ لکھنؤ کی شاعری اور سوسائٹی کے دامن پر نہ مٹنے والا داغ بن کر رہ گیا ہے۔

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

رعایت لفظی:

دبتان لکھنؤ کی ایک اور خصوصیت رعایت لفظی بتائی جاتی ہے اس پہلو کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں۔

لکھنؤ کا معاشرہ خوش مزاج، مجلس آر اور فارغ البال لوگوں کا معاشرہ تھا۔ مجلس زندگی کی جان، لفظی رعایتیں ہوتی ہیں۔ مجلسوں میں مقبول وہی لوگ ہوتے ہیں جنہیں ”زبان

پر پوری قدرت ہوا اور لفظ کا لفظ سے تعلق، اور لفظ کا معنی سے رشتہ پوری طرح سمجھتے ہوں۔ لفظی رعایتیں محفل میں تفریح کا ذریعہ ہوتی ہیں، اور طنز کو گوارا بناتی ہیں۔

لکھنؤ میں لفظی رعایتوں کا از حد شوق تھا۔ خواص و عوام دونوں اس کے بہت شائق تھے۔ روس اور امر ایک بندیاں کرنے والوں کو باقاعدہ ملازم رکھا کرتے تھے۔ ان ہی اسباب

کی بنابر لکھنؤ شاعری میں رعایت لفظی کی بہتات ہے اور لفظی رعایتیں اکثر مفہوم پر غالب آ جاتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات بعض لفظی رعایت کو منظوم کرنے کے لئے شعر کہا

جاتا تھا۔ مثال کے طور پر

ہندو پسر کے عشق کا کششہ ہوں باغبان

الله کا پھول رکھنا امانت کی گور پر

غمسل کر لے بیبیں دریا میں نہانے کونہ جا

محچلیاں لپٹیں گی اے یاد تیرے بازو سے

وصل کی شب پنگ کے اوپر

مثل چیتے کے وہ محلتے ہیں

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت

بعد مرنے کے میری تو قیر آدھی رہ گئی

تشبیہ واستعارات میں بیچ دار بار کی

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزان، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

گرچہ تشبیہ اور استعارے کا استعمال ہر شاعر کرتا ہے لیکن یہ چیز اس وقت اچھی معلوم ہوتی ہے جب حد اعدالت کے اندر ہو۔ شعر ادبی کے ہاں بھی اس کا استعمال ہوا لیکن لکھنؤالوں نے اپنی رنگین مزاجی کی بدولت تشبیہوں کا خوب استعمال کیا اور ان میں بہت اضافہ کیا۔ محسن کا کوروی، میر انیس، نسیم، دیر، نے پر کیف، عالمانہ اور خوب صورت تشبیہیں بر تی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی شعر اصراف تشبیہ برائے تشبیہ بھی لے آئے ہیں جس سے کلام بے لطف اور بے مزہ ہو جاتا ہے۔

سبزہ ہے کنارے آب جو پر

یا خضر ہے مستعد و ضوپر

محوتکبر فاختہ ہے

قد و قامت سرو دلربا ہے

کیاری ہر ایک اعتکاف میں ہے

ساتی کی مست آنکھ پر دل ٹوٹ جاتے ہیں اور آب روائ طوف میں ہے

شیشے جھک ہوئے ہیں پیالوں کے سامنے

آگیا وہ شجر حسن نظر جب ہم کو

بوسے لے کے لب شریں کے چھورائے توڑے

مستی میں زاف یار کی جب اہر اگی

بوتل کامنہ ہمیں دہن مار ہو گیا

محاورات والفاظ کا استعمال

دہستان دلی سے وابستہ شاعر اور ادیبوں کی تحریروں میں روزمرہ بکثرت ملتا ہے۔ کیونکہ دہستان دلی کی بنیاد ہی سادگی اور سلاست پر ہے۔ اس کے برعکس دہستان لکھنؤوالے تکلف، قصع، تشبیہ، استعارات سے عبارت کو سجاتے ہیں۔ جس سے اصل مقصد و مطلب قاری کی نگاہ سے او جھل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر نثر میں اس فرق کا بہترین نمونہ

علامہ اقبال اور پن یونیورسٹی کی معلومات کے لیے **AIOU Studio 9** یو ٹیوب چینل کو سب سکراپ کریں۔

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

میر امن کی شہرہ آفاق تصنیف ”بانگ و بھار“ اور رجب علی بیگ سرور کی ”فسانہ عجائب“ ہے۔ شاعری میں میر تقیٰ اور آتش لکھنوی اس کی بہترین مثال ہیں۔ محاورے دونوں استعمال کرتے ہیں، دبستان لکھنوا لے بھی اور دبستان دلی والے بھی۔ لیکن یہاں بھی ایک فرق بہت واضح ہے۔ وہ یہ کہ ”دبستان لکھنوا“ والے محاوروں کا استعمال غیر ضروری طور پر محض شوقیہ کرتے ہیں۔ جب کہ ”دبستان دلی“ والے صرف وہیں محاورہ استعمال کرتے ہیں جہاں ضروری ہو ابتدال اور عریانی

محبوب کے بیان میں عربی و ہر زہ گوئی کی جو حدیں جرات و انشاء کے کلام سے شروع ہوئی، ناخ اور ان کے شاگرد انہیں رکا کرت وابتدال اور غلوکی حد تک لے گیں۔ لکھنوی شاعروں نے صرف محبوب کے جسم کا ایک عضو گناہ شروع کیا بلکہ اسے چوٹی سے ایڑی تک بے نقاب کر ڈالا۔ اس ساری بحث سے ہرگز یہ مقصود نہیں کہ لکھنوی شعراء کے ہاں اعلیٰ درجے کی ایسی شاعری موجود نہیں جوان کے سوز و گداز جذبات اور احساسات اور واردات تلبیہ کی ترجمان ہو۔ تمام نقادوں نے اس بات کی تائید کی ہے بلکہ عذایب شادی جنہوں نے لکھنوی شاعری کے خراب پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ نمایاں کر کے پیش کیا ہے وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ شعراء لکھنوا کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو پڑھنے والے کے دل پر گہر اثر چھوڑتے ہیں۔ ایسے نمونے ناخ اور آتش کے علاوہ امانت آور رند و غیرہ کے ہاں سب سے زیادہ ملتے ہیں۔ یہاں اس بات کے ثبوت میں مختلف شعراء کے کلام سے کچھ مثالیں

رنگ سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی

دل ہی دل میں اسے ہم یاد کیا کرتے ہیں

تاب سننے کی نہیں بہر خدا خاموش ہو

کلڑے ہوتا ہے جگرناخ تیری فریاد سے

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے

میں جاہی ڈھونڈتا تیری محفل میں رہ گیا

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

کسی نے مول نے پوچھا دل شکستہ کا

کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

بتوں کے عشق میں کیا بھی کو اخطراب دیا

یہ دل دیا کہ خدا نے مجھے عذاب دیا

دل نے شب فرقت میں کیا ساتھ دیا میرا

مونس اسے کہتے ہیں غم خوار اسے کہتے

آئندہ لیب مل کے کریں آہ وزاریاں

توہائے گل پکار میں چلاوں ہائے دل

ہم اسیروں کو قفس میں بھی ذرا چین نہیں

روزدھڑ کا ہے کہ اب کون رہا ہوتا ہے

حرم کو اس لئے اٹھ کر نہ بکدے سے گئے

خدائی گا کہ جو ریتاں اٹھانے سکا

لکھنؤ کے شعر اکے دو اوین سے عورتوں کے زیورات و پوشش کی مفصل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے، زنانہ الفاظ و محاورات کے غالبہ سے بھی اندازہ

ہوتا ہے کہ معاشرہ کے اعصاب پر عورت کس طرح سوار تھی اور وہ عورت کس مزاج و افتد طبع اور اخلاقی رتبہ کی حامل تھی، معاشرہ کے اسی ذوق اور اس شعری اور ادبی

رجحان کا سلسلہ وہ ابتنال اور معاملہ بندی سے ملاتے ہیں، نسائیت و فخش گوئی پر ریختی کی بنیاد پڑی، جس میں پیشہ ور عورتوں

کے مستبدل جذبات بازاری و عامیانہ زبان میں ادا ہوتے ہیں۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

دیکھنا کیا حسن کی دولت کا کوٹھا توڑ کر

نکلی ہیں سر پر لیے دوب درہ زر چھاتیاں

کس قدر صاف ہے تمہارا پیٹ

صف آئینے کا ہے سارا پیٹ

وہ تو آنجل سے دوپٹے کو چھپاتے ہیں، بہت

ہے یہ جو بن نکلی ہی پڑتی ہیں باہر چھاتیاں

سمجھوں نہ حباب آپ کے پستانوں کو کیوں کر

دریا شکم صاف ہے دریا کا بھنور ناف

کیا چکنے ہیں، کیا صاف ہیں، کیا گول سریں ہیں

بے جرم ہیں، نایاب ہیں، ان مول سریں ہیں

زانوں کی طرح صاف ہیں اوس حور کی ساقیں

آئینے کی رانیں ہیں تو بلور کی ساقیں

دہستان لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت دہستان دہلی سے بالکل الگ ہے۔ دلی کی معاشی اور اقتصادی حالت بہت خراب تھی۔ جب سے اردو پروان چڑھی دہلی ہر قسم کی آفتوں کا نشانہ بنتی رہی وجوہ ہے کہ جعفر زمی سے لیکر غالب اور داغ تک تمام ممتاز شعراء شہر آشوب لکھتے رہے۔ بہادر شاہ ظفر کے درد بھرے نالے اسکے گواہ ہیں۔ ایسے حالات میں جب کہ بادشاہ سے لے کر فقیر تک معاشی بدحالی میں گرفتار ہوں، روز روza انقلابات ہو رہے ہوں۔ ایسے مقام کے باشندوں پر مایوسی اور ناکامی کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے برخلاف لکھنؤ میں تمام طرح کی سہولتیں فراہم کی جا رہی تھیں، عیش و عشرت کا بازار گرم تھا۔ اس لیے وہاں کے لوگوں میں سرمستی اور رُنگین مزاجی کا ہونا لازمی تھا۔ ان کا

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

نظر یہ زندگی کے متعلق ثابت تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دہلی میں تباہی تھی تو لکھنؤ میں تعمیر و ترقی۔ اس لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دہلی کی شاعری آہ و غم کی شاعری ہے اور لکھنؤ کی شاعری واہ اور خوش مزاجی کی شاعری ہے۔

دہستان دہلی کی شاعری میں روحانی یادی جذبات کی کار فرمائی ہے اور لکھنؤ میں ظاہری حسن اور سر اپا کا ذکر ہے۔ دہلی کی شاعری کے لئے دلگد از ہونا ضروری ہے جبکہ لکھنؤ میں صرف طبیعت کا موضوع ہونا۔ دلی کے شعرا نے حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کی شاعری داخلی ہے اسی لئے ان کے بہاں روحانی اور تصوفانہ مضامین زیادہ نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس لکھنؤ کی شاعری میں سر اپا نگاری اور معاملہ بندی تک شعراً محدود نظر آتے ہیں۔

لکھنؤ کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ دراصل لکھنؤیت دہلویت کے مقابلے شعر و شاعری کا ایک دوسرا رخ ہے۔ دہلی کے وہ شعرا جو لکھنؤ آگئے تھے وہاں کی خوشحالی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ 1765ء میں شجاع الدولہ نے فیض آباد کو دارالحکومت بنایا تو اس کی تعمیر میں لاکھوں روپے صرف کیے۔ آصف الدولہ نے 1775ء میں لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت بنایا تو وہ تمام شان شوکت لکھنؤ میں منتقل ہو گئی۔ آصف الدولہ سے لے کر واحد علی شاہ تک کے زمانے کا لکھنؤ ایک رنگیں خواب تھا اس لیے بہاں کے لوگوں میں رنگیں مزاجی اور رنگیں خیالی رچ بس گئی تھی۔ اس ماحول نے وہاں کے شعرا نے کھیلات کو بھی آکوڈہ کر دیا اور آہستہ آہستہ فاشی ایک مستقل صنف بن گئی اور نجاشی اور نسوانیت سے ملکر رُنچتی، کی بنیاد پڑی۔ رُنچتی میں عورتوں کے احساسات و جذبات کو انہی کی زبان اور محاورے میں پیش کیا جاتا ہے۔

دہستان لکھنؤ کے شعرا نے اپنی تمام تر توجہ ظاہری خوبصورتی پر صرف کی، اندر ورنی احساسات و جذبات پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ تکلف قصع کو لکھنؤی تہذیب و معاشرت میں زیادہ فوقیت دی گئی۔ نسخ جو لکھنؤی شعرا میں استاد مانا جاتا ہے۔ انہوں نے اصلاح زبان کی تحریک شروع کی اس کے پیش نظر انہوں نے ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کو خارج کر کے فارسی اور عربی کے الفاظ کو جگہ دی۔ دہستان دہلی کے شعرا نے ہندی اور دوسری زبانوں سے بھی استفادہ کیا لیکن لکھنؤی شاعری نے اصلاح زبان کے نام پر عربی اور فارسی کو اولیت دی۔ لکھنؤی شعرا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے لغت پر زیادہ توجہ دی اور اسی کے مطابق زبان کی ادائیگی پر زور دیا۔ جبکہ دہلی کے شعرا نے مروجہ زبان پر زیادہ توجہ دی۔

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزان، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

دبتان لکھنؤ میں مرثیہ کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ نیس اور دیبر نے اس صنف کو ترقی دی اور مرثیے کو رومنے سے نکال کر نئی شکل عطا کی۔ مدرسہ لکھنؤی مزاج نے موسمی اور قص کو خاص طور سے اپنایا جس کی وجہ سے ڈرامائی نظم کی بنیاد ڈالی گئی۔ دبتان دہلی اور دبتان لکھنؤ میں خاص فرق زبان کا ہے۔ دلی میں بعض الفاظ جو مونٹ بولے جاتے تھے لکھنؤ میں مز کر کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دبتان دلی کے شاعری داخلی شاعری ہے اور دبتان لکھنؤ کی شاعری میں محبوب کی ظاہری صورت یا سراپا کو بیان کیا گیا ہے۔ اپنا اصلی اس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں دبتانوں کی اپنی اپنی شاخت ہے جس کی وجہ سے دونوں میں امتیاز کیا جاتا ہے۔

رات کو چوری چھپے پہنچا جو میں

غل مچایا اس نے دوڑو چور ہے

کچھ	اشارة	جو کیا	ہم	نے	ملقات	کے	وقت
ٹال کر کہنے لگا دن ہے	ابھی رات کے وقت						

ANS 03

فورٹ و لیم کالج کے بعد دلی کالج اردو نشر کی ترقی کا دوسرا ذینہ کہا جاسکتا ہے اور اتفاق سے اس کو قائم کرنے والے بھی انگریز ہی تھے۔ فورٹ و لیم کالج زبان اور ادب کی طرف راغب ہونے کی پہلی کڑی تھی اور دلی کالج دوسری۔ اگرچہ ان دونوں کے درمیان وقت کا بہت زیادہ تفاوت نہیں ہے۔ لیکن اتنا تھوڑا فرق بھی سمجھ بوجھ کر قدم اٹھانے والے کے لیے بہت کافی ہوتا ہے اور شاید اس وجہ سے دہلی کالج نسبتاً فورٹ و لیم کالج سے زیادہ لکھری اور سنوری ہوئی شکل تھی۔ دونوں کو قائم کرنے کا اگرچہ ظاہری مقصد ایک سا گلتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر دونوں میں یہ فرق تھا کہ فورٹ و لیم کالج انگریزی طلباء کو ہندستانی زبان سکھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا اور دہلی کالج ہندستانی طلباء کو انگریزی تعلیم سے واقف کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب فورٹ و لیم کالج روبرہ اخاطط تھا، سیاسی اعتبار سے ہندستان اپنی ساری طاقت کو کھو چکا تھا اور انگریز پورے طور پر ہندستان پر قابض ہو چکے تھے، لہذا اب ان کا دخل بہاں کی تہذیب و ادب میں بھی ہو چکا تھا۔ ہندستانیوں کی اچھائی اور برائی کی ذمہ داری بھی انگریزوں کے سر آچکی تھی۔ ایسے ماحول میں ہندستان

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزان، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

کی تعلیم و ادب کی ترقی وغیرہ کی ذمہ داری بھی انگریزوں پر تھی۔ اپنے آپ کو یہاں کی زبانوں میں ڈھالنے کے بعد یہاں کے لوگوں پر اپنی انگریزی تعلیم کا باراٹھانے کے لیے طرح طرح کے پروگرام بنائے۔ گروپ بنے۔ کمیٹیاں قائم کی گئیں اور اس طرح کی ایک کمیٹی 17 جولائی 1823ء کو دہلی میں بنائی گئی۔ جس پر خرچ کرنے کے لئے ایک لاکھ روپے کی رقم طے کی گئی۔ اس کمیٹی کے سکریٹری و لسن منتخب کیے گئے۔ جو سنکرت اور دیگر علوم مشرقيات کے ماہر تھے۔ جے۔ ٹلر (J.TAYLER) نے اس منظوری کے بعد پورے دہلی شہر کا جائزہ لیا کہ کس مقام پر ایک ایسے کالج کی بنیاد ڈالی جائے جس میں مشرقی اور مغربی تعلیم کو جاری رکھا جاسکے۔ جائزہ لینے کے بعد جے ٹلر نے جو پورٹ دی وہ حسب ذیل ہے:

"دہلی میں تعلیم کی حالت بڑی افسوس ناک ہے۔ پرانے او قاف بے توجہی کا شکار ہیں اور شرفاء تک اپنے بچوں کو پڑھانے کا انتظام نہیں کر سکتے۔ اس وقت پرانے مدارس سک رہے ہیں، لیکن ان کی عمارتیں اور معلم موجود ہیں۔ اگر تعلیم کی اس سرنو تنظیم ہو تو اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔"

اس خیال کے تحت اس وقت کا ایک تعلیمی ادارہ مدرسہ غازی الدین جس کی بنیاد 1792ء میں پڑھکی تھی اور اب تک یہ مدرسہ اسی نام سے مشہور تھا اور دہلی کی مدد ہی اور ادبی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ 1828ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"غرض اس مجوزہ کالج کا افتتاح 1825ء میں ہوا اور اس شہابانہ عطیے میں سے اس کالج کے لیے پانچ سور روپے ماہانہ مقرر کیے گئے۔ مسٹر جے۔ ٹلر مقامی مجلس کے سکریٹری ایک سو پچھتر روپے ماہانہ پر اس کے پرنسپل ہوئے۔"

اور تین مقاصد کو لے کر (الف) علم و ادب کا احیاء اور انہیں ترقی دینا۔ (ب) ہندستانی علماء کی حوصلہ افزائی کرنا۔ (ج) علم اور سائنس کو ہندستان کے برطانوی مقبوضات کے باشندوں میں رائج کرنا اور انہیں فروع دینا۔ کالج پر پوری توجہ دی جانے لگی۔ رفتہ رفتہ حکمرانوں کی جانب سے اس کے اخراجات پر خاص توجہ دی جانے لگی۔ جلد ہی معاشری طور پر ایک انقلاب آیا۔

1825ء میں اعتماد الدولہ نے مدرسے میں مشرقی علوم کے لیے ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم وقف کر دی، جس سے اس کالج کو بہت بڑا سہارا مل گیا۔ تیجہ یہ ہوا کہ کالج کے تمام شعبوں نے پورے طور پر منظم ہو کر اپنے کارناۓ انجام دینے شروع کر دئے اور اس مدرسے نے ایک نئی شکل اختیار کر کے دہلی کالج کے نام سے ملک بھر میں شہرت حاصل کی۔

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزان، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

دلی کالج نے اپنی شہرت تو اختیار کر لی، لیکن جس مقصد کے لیے وزیر لکھنؤ کی جانب سے اتنی کثیر رقم دی گئی وہ فوت ہو گیا۔ یعنی اس رقم کا مقصد محسن علوم مشرقی کو فروغ دینا تھا، لیکن انگریزوں نے اس پر توجہ کم دی اور تین سال بعد 1828ء میں کالج میں ایک الگ انگریزی شعبہ کھول دیا۔ ابتداء میں سماجی اعتبار سے اس کے اچھے اثرات نظر میں آئے، لیکن رفتہ رفتہ انگریزوں نے اپنے مقصد میں کامیابی پائی۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے انگریزی کا شعبہ کھولا، انگریزی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ لیکن اس کے ساتھ سانسکرٹ، عربی، فارسی کے درجہ پر بھی پوری اہمیت دی جاتی تھی۔ نتیجہ کے طور پر مشرقی اور مغربی تعلیم دونوں زوروں سے آگے بڑھنے لگیں۔ دونوں زبانوں کی خصوصیات ابھر کر سامنے آنے لگیں۔ لیکن رفتہ رفتہ انگریز اپنے مقصد کی طرف بڑھنے لگے۔ انہوں نے انگریزی شعبہ کی اہمیت میں اضافہ شروع کر دیا۔ انگریزی پڑھنے والوں کے لیے ایک خاص قسم کا وظیفہ مقرر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ تر طالب علم انگریزی کی طرف بڑھنے لگے۔ اور اس کالج کے قائم کرنے کا اصل مقصد بھی یہی تھا۔ لیکن باوجود اس کے کہ طلباء انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگے، مشرقی علوم کی دلچسپی میں ذرا بھی کمی نہ آئی۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت کا ہر عالم اپنی زبان تو جانتا ہی تھا، ساتھ ہی اس نے انگریزی تعلیم کی شہرت اور اس کی ترقی کے راز کو بھی جاننے کی کوشش کی تھی۔ اور یہی بات انگریزی تعلیم کی کامیابی کی وجہ بن گئی۔

امتداد زمانہ کے تحت دلی کالج کو باد سوم کے جھونکوں سے بی دوچار ہونا پڑا اور 1857ء کا ہنگامہ اس کے لیے بھی مصیبت بن کے آیا۔ جب میرٹھ کی فوج دہلی میں گھس آئی تو تمام انگریز حکام ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اس میں ٹیڈر صاحب (پرنسپل) باغیوں کے ہاتھوں مارڈا لے گئے۔ اسامتہ منتشر ہو گئے۔ کتابیں جلا دی گئیں۔ ماں رام لکھتے ہیں:

"اس شورش سے کالج کو بہت نقصان ہوا۔ مدرسوں میں جو لوگ دیسی سپاہی کے چنگل سے نکلے، وہ تجزیت ہو گئے۔ کتاب خانہ وقف تاراج ہوا۔ جاہلوں نے کتابوں کو چیرپھاڑ کے ورق ورق کر دیا۔ یہاں کا سامان توڑ پھوڑ کر اسے ہمیشہ کے لیے بیکار بنا دیا۔"

سات برس تک بند رہنے کے بعد 1864ء میں یہ کالج پھر قائم ہوا۔ اب اس کی جگہ بھی تبدیل ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ 1857ء کے ہنگامے نے اسے اس قدر کمزور کر دیا کہ پہلے والی شکل اب نہ رہ گئی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اب انگریزوں کے رویے میں بھی تبدیلی آچکی تھی۔ تقریباً نصف صدی کی عمر پانے کے بعد یہ کالج کتنی مشکلات سے گذرتا ہوا 1877ء میں اپنے اختتام پر پہنچ گیا۔

دلی کالج اردو نشر کی ارتقا میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ رہی کہ تمام مضامین فلسفی، سائنس یا کوئی بھی مضمون ہو اردو کے ذریعے پڑھائے جانے لگے۔ لہذا اردو نشر میں یہ پہلا موقع تھا جب مشرقی اور مغربی علوم آپس میں گلے مل رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کی خصوصیات کو باہم جذب کرتے جا رہے تھے۔ اور

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزان، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

صورت حال یہ تھی کہ دلی کالج سے قبل کاماحول م Haskell دستیاب تھا۔ لیکن دلی کالج نے مغربی علوم کی روشنی میں مشرقی علوم کو چھکایا۔ فرسودگی کو دور کرنے کی کوشش کی اور دل و دماغ میں علم و روشنی کی ایک نئی کرن جگہ گئی۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کالج سے رام چندر، پیارے لال آشوب، مولوی کریم الدین، امام بخش صہبائی، محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، نذیر احمد جیسی اہم اور نامور شخصیتیں وجود میں آنا شکل تھیں۔ اس کے بعد گرد و پیش کے تمام مااحول کو بیدار کرنے اور جملہ علوم و فنون سے دلچسپی پیدا کرنے میں جو رول ادا کیا ہے اس کا اندازہ اس وقت کی اہم شخصیات اور تصنیفات کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ بہاں پر ان سب کا ذکر کر کے طوالت منظور نہیں۔ کالج کے اساتذہ اس میں شک نہیں کہ زیادہ تر انگریز ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہندستانی بھی اس میں شامل تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ اور مولوی امام بخش صہبائی جیسے منتخب اساتذہ کا تعلق بھی اسی کالج سے تھا۔ پہلی بار دہلی کالج کے ذریعہ مشرق و مغرب کا انتساب پور ملک پر ہوا۔ بقول عبدالحق مرحوم کے کہ ایک ہی چھٹت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ اس ملک نے خیالات کے بدلتے، معلومات کے اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں جادو کا ساکام کیا اور ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کی جس میں سے ایسے پختہ، روشن خیال اور جامع النظر مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور ہماری سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔ نذیر احمد، آزاد، ذکاء اللہ سب اس کالج کی ہی دین ہیں، جنہوں نے اردو نشر میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ نذیر احمد نے ناولوں کا آغاز کیا۔ آزاد نے "آب حیات" لکھی اور جدید نظموں کی طرف ذہن موڑا۔ ذکاء اللہ نے ترجمہ کیے۔ ان سب ادیبوں نے ادب کو ایک نئے ڈھرے اور ایک نئی راہ پر لگایا اور ایک ایسا مستحکم راستہ نکالا جس پر آگے چل کر دوسرے ادیبوں نے اس راہ کو اور خوبصورت بنایا۔ نذیر احمد اپنے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن، گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہاد اعلیٰ وغیرہ۔ یہ چیزیں جو تعلیم کے لیے عملہ تباہ ہیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں ان کو میں نے کالج میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اور اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہو تو کیا بتاؤں کا ہوتا؟ مولوی ہوتا۔ تنگ خیال ہوتا۔۔۔ اپنے نفس کے اعتساب سے فارغ۔ دوسروں کے عیوب کا ممتنع۔ برخود غلط مسلمانوں کا نادان دوست۔ تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا۔"

اردو نشر کے ارتقاء میں دلی کالج فورٹ ولیم کالج کے بعد اور علی گڑھ تحریک سے قبل ایک اہم کارنامہ ہے، جس کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ یہ ان دونوں کے پیش کی ایک کڑی ہے۔ اس کی روشنی، اس کا بالغ ذہن، انگریزیت اور اس کی بیداری نے سر سید کی ہمت افزائی کی اور انہوں نے علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی۔

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزان، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ داستان ادب اور صحافت نے زور کپڑا اور سلیس اور آسان نشر کا اضافہ ہوا۔ دلی کالج نے اس آسان نشر میں فکر و روشنی اور انگریزی علوم کے وہ عناصر

جدب کردئے جس سے اس زبان کے نثری سرمایہ میں ایسی چمک اور ریگنی آئی کہ اس کی شکل اپنے انگریزی آئی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ وہ اپنی خوبصورتی اور اپنی ریگنی سے

دوسروں کی نظر وہ میں دلکشی کا سبب بن گئی۔ لوگوں کی نظریں اس کی جانب اٹھنے لگیں۔ علی گڑھ تحریک کا تمام نثری سرمایہ اسی کا رد عمل ہے۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور

علی گڑھ کالج کے درمیان تسلسل کے بارے میں ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوالی کی یہ تحریر قبل توجہ ہے:

"اردو نثر کی تاریخ میں دلی کالج، علی گڑھ تحریک اور فورٹ ولیم کالج کے درمیان ایک کڑی ثابت ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد نشر پر جمود طاری ہونے کے بجائے دلی کالج اور

اس سے متعلق حضرات کی بدولت چند اعلیٰ روایت کی داغ بیل پڑی اور ادب میں نمو اور بالیدگی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ فورٹ ولیم کالج سے یہ اس بنا پر ممتاز تھا کہ

یہاں ہندستانیوں کو اردو کے ذریعے مغربی علوم و ادب سے آشنا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جب کہ فورٹ ولیم کالج کا اصل مقصد حکومت کی ضروریات کے پیش نظر

انگریزوں کو مشرقی علوم و ادب اور زبانوں سے واقفیت بھم پہنچانا تھا۔ یہ فرق ان دونوں اداروں کی شائع کی ہوئی کتابوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ علی گڑھ کالج اور دلی کالج میں

کوئی بینیادی اختلاف نہ ہونے کی وجہ سے ایک اہم فرق یہ تھا کہ مغربی علوم کی تدریس کا ذریعہ انگریزی ہی کو بنایا گیا، جب کہ دہلی کالج نے اردو کو بطور ذریعہ تعلیم تسلیم کیا اور

اس زبان کے ذریعے ہندستان مغربی علوم کی اشاعت کو ترجیح دی۔"

ANS 04

عربی کے شاعر، زبیر ابن ابی سلمی کا قول ہے کہ سب سے بہتر شعر جو تم کہہ سکتے ہو وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو لوگ کہیں کہ سچ کہا ہے۔

حالی گئی مسدس "موجز اسلام" اس قول پر پوری اترتی ہے۔ سچ کے ساتھ اس میں دو خوبیاں وہ بھی ہیں جن کا ذکر ہمارے قدمانے کیا ہے یعنی سادگی اور جوش۔ یہ حقیقت ہے

کہ وہ جنہیں یہ قدرت ہوتی ہے کہ وہ شعر کے ذریعے سے دلوں میں اثر پیدا کر دیں ایک ایک انھیں ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں لفظ لوگوں

کے جذبات پر کیا اثر کھتا ہے اور اس کے استعمال کرنے یا نہ کرنے سے بیان میں کیا خوبی پیدا ہوتی ہے۔ مسدس "موجز اسلام" کا لکھنے والا ایسا ہی شاعر ہے۔

اس نظم کے محرك سر سید تھے۔ انھیں حالی گئی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ تھا اور اس وقت مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کا بھی ادراک تھا۔ انھوں نے حالی سے کہا کہ

مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان ایسی پر اثر نظم میں بیان ہونی چاہیے جو انھیں سوتے سے جگا دے، اور ان میں فکر و عمل کی شمع پھر سے روشن کر دے۔

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

مسدس عالی 1879ء میں مکمل ہوئی۔ حالی آس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ”ہر چند کہ اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اٹھانا دشوار تھا لیکن ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دل ہی سے نکلی تھی، دل ہی میں جا کر ٹھہری۔ بر سوں کی بھجی ہوئی طبیعت میں ایک ولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں ابال آیا۔ ایک افسر دل اور بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، انھیں سے کام لینا شروع کیا۔ اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی۔ دنیا کے مکروہات سے فرصت بہت کم ملی اور بیاریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہیں ہوا، مگر بہر حال دل میں دھن لگی رہی۔ بارے الحمد للہ بہت سی وقوف کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندے کی بساط کے موافق تیار ہو گئی اور ناصح مشقق سے شرمندہ نہ ہونا پڑا۔ صرف ایک امید کے سہارے پر یہ راہ دور دراز طے کی گئی ہے، ورنہ منزل کا نشان نہاب تک ملا ہے نہ آئندہ ملنے کی توقع ہے۔

حالی نے اس مسدس کے آغاز میں چند بند بطور تمہید لکھ کر پہلے عرب کی اس ابتر حالت کا نقشہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جوزمانہ جاہلیت کہلاتا ہے۔

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ

ہر اک لوٹ اور مار میں تھا گانہ

فسادوں میں کثٹا تھا ان کا زمانہ

نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ

وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے

درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

پھر اسلام کا چاند نکلتا ہے اور اللہ کے رسولؐ کی تعلیم سے یہ ریگستان دفعتاً سر سبز و شاداب ہو جاتا ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

علامہ اقبال اور پنیونیورسٹی کی معلومات کے لیے AIOU Studio 9 یو ٹیوب چینل کو سب سکرائب کریں۔

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

وہ اپنے پرائے کاغذ کھانے والا

فقیروں کا بجا ضعیفوں کا ماوی

تیمبوں کا دالی غلاموں کا مولیٰ

☆☆☆☆

مس خام کو جس نے کندن بنایا

کھرا اور کھوٹا الگ کرد کھایا

عرب جس پر قرنوں سے تھا جہل چھایا

پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ذرنہ بیڑے کو موچ بلکا

ادھر سے ادھر پھر گیارخ ہوا کا

حالی نے پھر یہ ذکر کیا ہے کہ کس طرح اللہ کے رسول امتحان کی کھیت کو ہر ابھر اچھوڑ کر اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ پھر بتایا ہے کہ مسلمانوں نے کس طرح دینی اور دنیاوی

ترقی میں تمام عالم پر سبقت حاصل کی اور پھر اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے تنزل کا حال بیان کیا ہے اور قوم کے لیے اپنے ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں

آکر مسلمان دیکھ سکتے ہیں کہ کون تھے اور کیا ہو گئے۔

حالی گھتتے ہیں، ”اگرچہ اس جاں کاہ نظم میں جس کی دشواریاں لکھنے والے کا دل اور دماغ ہی خوب جانتا ہے، بیان کا حق نہ مجھ سے ادا ہوا ہے اور نہ ہوتا ہے تھا مگر شکر ہے کہ جس

قدر ہو گیا اتنی امید بھی نہ تھی۔“

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزان، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

موضوع کی نویسیت، حقیقت بیانی اور زبان و بیان کی سادگی اور بے سانگھٹی نے مسدس حالی کو بے پناہ مقبولیت بخشی اور یہ ہماری قومی شاعری کی اولین سنگ میل ثابت ہوئی۔

اس نظم نے سر سید کو اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے حالی کو خط میں لکھا۔ ”بے شک میں اس کا محرك ہوں اور میں اس کو اپنے اعمال حسنے میں سمجھتا ہوں جب خدا روز مختصر مجھ سے

پوچھے گا کہ تو کیا لایا ہے تو میں عرض کروں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔“

مسدس کو چھپے ڈیڑھ صدی ہونے کو آئی ہے لیکن اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہ ہوئی ہے، یہ اب تک اتنی بارچھی ہے کہ شاید ہی کوئی دوسری کتاب چھپی ہو اور اتنی مقبول

ہوئی ہو کہ بار بار چھپے۔

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں، ”اس نظم کی رومنی حرمت اگلیز ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا امداد اچلا آرہا ہے۔ شروع سے آخر تک ایک عجیب تسلسل ہے، جس کا تاریکیں نہیں ٹوٹا

اور پڑھنے والے کو ایک لمحے کے لیے بھی کہیں رکنے کی نوبت نہیں آتی۔ جوش کی وہ فراوانی ہے گویا ایک چشمہ ابل رہا ہے۔ باوجود ادبی خوبیوں کے سادگی کا یہ عالم ہے کہ اس

پر ہزار صنائع بدائع، قربان ہیں اور ہزار خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کی بنت صداقت پر ہے۔ ادب میں حسن و خوبی کا آخری معیار صداقت یا حقیقت ہے۔ شعر کی نسبت

جو یہ کہا گا ہے کہ اسے حقیقت یعنی زندگی اور واقعات زندگی سے وابستہ ہونا چاہیے وہ اس پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ یہ مسدس ہماری قومی زندگی کا کامل مرقع ہے جس میں

ہمارے خدو خال صاف نظر آتے ہیں۔“

ANS 05

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو ترقی پسند تحریک اپنے خاص سیاسی، ادبی اور سماجی تناظر میں جس قدر مقبول ہوئی اسی قدر

اسے طعن و تشنج کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ اس تحریک کی ہمہ گیر مقبولیت میں جہاں اس کے جدت پسند منشور اور اس کے تحت تخلیق ہونے والے ادب کا عمل دخل ہے، جو فکر کے

ٹھہرے ہوئے پانی میں پہلا پتھر ثابت ہوا، وہاں ان شخصیات کی شب و روز کی محنت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جنہوں نے پورے خلوص کے ساتھ اس کے منشور پر عمل

کیا۔ خود ترقی پسندوں کی نظر میں اس کے مقابلے میں کوئی اور تحریک ٹھہرتی ہی نہیں۔ ظہیر کا شمیری اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

”۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد سے لے کر موجودہ دور تک اردو ادب میں اگر کوئی معتبر تحریک ہے تو وہ ترقی پسند ادب کی تحریک ہے۔ اس تحریک کے زیر اثر جو ہمہ جتنی

لڑ پیچ پیدا ہوا اس کے مقابل پر کوئی رجحان ابھی تک ادب میں پیدا نہیں ہوا۔“ (۱)

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

تحریک کوئی بھی ہوا اور کسی قسم کی، وہ یوں ہی جنم نہیں لے لیتی بلکہ ہر تحریک کے عناصر بقول پروفیسر صدیق الرحمن قدوسی، پہلے سے فضایں موجود ہوتے ہیں جو خود کو تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں، تنظیم و ترتیب کے عمل سے گزرتے ہیں پھر نمایاں ہو کر ایک عہد کے عام شعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔ (۲) جب ہم ترقی پسند تحریک کی مقبولیت کے اساسی عناصر تلاش کرتے ہیں تو ہماری نگاہیں سجاد ظہیر جنہیں ترقی پسند تحریک کا باوا آدم کہتے ہیں، سے بھی پہلے پروفیسر احمد علی اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری پر جا ٹھہر تی ہیں۔ یہ ہر دوادیب رومانی باغی کے طور پر سامنے آئے۔ پروفیسر احمد علی نے دسمبر ۲۳۹۱ء میں افسانوں کی ایک کتاب "انگارے" کے نام سے شائع کی جس میں احمد علی کے علاوہ سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود اظفیر کے افسانے شامل تھے۔ افسانوں کی یہ کتاب رومانیت کے خلاف بغاوت نامہ اور ترقی پسندی کا نقطہ آغاز تھی۔ انگارے کے افسانوں میں سجاد ظہیر کے بقول سنجیدگی اور ٹھہر اؤکم اور سماجی رجعت پرستی اور دینیوں سیت کے خلاف غصہ اور یہجان زیادہ تھا۔ (۳) جو گندرپال، انگارے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"انگارے کی کہانیاں ترقی پسند توروں کا راست اور بلند بانگ اظہار کرتی ہیں اور اگرچہ فنِ اعتبار سے کوئی بہت عمدہ معیار نہیں بنائیں تاہم اس لیے اتنی اہم ہیں کہ اردو قارئین کو ان کے ذریعے پہلی بار ہم عصر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا موقع فراہم ہوا۔ اس کتاب کی بدولت ایک سید ہمی لکیر میں پڑھی ہوئی اردو کہانی ایک دم ہمہ جہت ہونے لگی اور یوں اس کی موضوعاتی وسعت میں آنے والے دور کی بعض بڑی کہانیوں کے لیے زمین ہموار ہوتی چلی گئی۔" (۴)

انگارے کی کہانیاں اردو ادب میں نئے تجربے کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن مشرق کے ثقہ مزاج نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نیاز فتح پوری اور عبدالمajed دریابادی جیسے مصنفوں نے اس کتاب کی مخالفت میں مضامین اور اخبار "مدینہ" اور "سر فراز" نے مخالفانہ ادارے کھانچہ مارچ ۱۹۳۳ء میں یہ کتاب ضبط کر لی گئی۔

انگارے مخصوص ایک تجربہ تھا۔ اس کتاب میں زندہ رہنے کی قوت نہیں تھی۔ اگر اس کی ضبطی کا واقعہ پیش نہ آتا تو شاید یہ کتاب بہت جلد زمانے کی گرد میں گم ہو جاتی۔ اس کی ضبطی نے اسے غیر معمولی اہمیت دے دی تیجہ لوگ اسے تلاش کرنے پر مائل ہوئے اور بقول پروفیسر احمد علی لوگوں نے اسے ٹھپ ٹھپ کروالہانہ دلچسپی سے پڑھا۔ (۵) انگارے نے بلاشبہ مشرق کی تہذیبی روایات کو شکستہ کرنے کی کوشش کی اور کتاب کی ضبطی نے اس تلاطم کو تیز کرنے میں مدد دی چنانچہ نوجوان ادبار و مانیت سے ہٹ کر زندگی کے مسائل کے بارے میں سوچنے لگے اور اس کا عملی ثبوت پروفیسر احمد علی نے اپنی نئی کتاب "شعلہ" میں دیا۔ ہر چند شعلے میں انگارے جیسی گرمی نہیں تھی تاہم جس ترقی پسند انداز کو انگارے میں اہمیت ملی تھی وہی شعلے میں بھی موجود تھا۔ انگارے اور شعلے نے فضایں تحریک تو پیدا کیا لیکن اس بغاوت کو جو رومانی نوعیت کی تھی، فکری بنیاد مہیانہ ہو سکی۔ دوسری طرف فطرت کے جن پوشیدہ رازوں کو ادب کے ذریعے مکشف کرنے کا آغاز کیا گیا تھا عوام ان کی ضرورت اور اہمیت سے واقف نہیں تھے۔ (۶)

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

ترقی پسند تحریک کو اساس فراہم کرنے والوں میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اہم نام ہے۔ اپنے ایک مقالے ”ادب اور زندگی“ میں جو ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا، انہوں نے لکھا: ”ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجیحی اس طریقے سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اثر قبول کر سکیں، اس کے لیے دل میں خدمتِ خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاہیے۔

۲۔ ہر ایمان دار اور صادق ادیب کا بشرب یہ ہے کہ قوم و ملت اور رسم و آئینی کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی، یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے۔
 ۳۔ ادیب کو رنگ و نسل اور قومیت و طفیلیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت اور مساوات کی حمایت کرنی چاہیے اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم پابند کرنا چاہیے جو دریائے زندگی کو چھوٹے چھوٹے چوپھوں میں بند کرنا چاہتے ہیں۔“ (۷)

بادی انظر میں یہ خیالات وہی تھے جو جن کا عملی اطہار ”انگارے“ اور ”شعلے“ کے افسانوں میں کیا گیا تھا۔

پیرس میں ہونے والی ادیبوں کی بین الاقوامی کافرنس وہ اہم عنصر ہے جو ترقی پسند تحریک کی اساس ثابت ہوا۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں دنیا کے چند اہم ادیبوں نے پہلی بار ادب کو تحریک بنانے پر زور دیا تھا۔ یہ کافرنس 'World Congress of the defence of Culture' کے نام سے نازی ایم اور فاشزم کے دوہرے عفریت کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے بلائی گئی تھی۔ اس کافرنس میں ہنری باریس، میکسیم گور کی، ریمن اولال، تھامس مان، آندرے مارلو اور والٹ فریک وغیرہ شریک تھے۔ اس کافرنس نے طے کیا تھا کہ ادیب و شاعر اپنی ذات کے نہایاں خانوں میں مقید رہنے کی بجائے انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ اقدار کی پاسبانی کریں گے۔ اس کافرنس کا پیغام تھا کہ رجعت پسندوں کا مقابلہ کیا جائے اور فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا جائے۔

سجاد ظہیر جو انگارے کی تدوین میں برابر کے حصے دارتھے، جب ادیبوں کی اس بین الاقوامی کافرنس میں شریک ہوئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ دنیا کی دوسری زبانوں اور ممالک کے ادیب بھی انہی مسائل سے نبرد آزمائیں جن سے خود وہ اور ان کی زبان و ملک کے ادیب دوچار ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ملک کے ادیبوں کو بھی ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ سجاد ظہیر اس وقت تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لندن میں مقیم تھے اور وہاں چند ہم خیال ادیبوں کا ایک حلقہ بھی قائم کر کھاتھا جس کی ہر مہینہ باقاعدگی سے نشستیں بھی ہوتی تھیں۔ یہ نوجوان ادیب و شاعر ادب کی تحقیق کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی اور خود اپنے ملک کے حالات کا تجزیہ کرتے تھے۔

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

کا نگریں میں شرکت کے بعد سجاد ظہیر نے اسی حلقة کو انجمن ترقی پسند مصنفوں میں بدل دیا اور اس کی باقاعدہ تنظیم کی، اس کا ایک دستور بھی ترتیب دیا۔ دستور کی ترتیب میں ڈاکٹر گھوش، محمد دین تاثیر، پرمود سین گپتا اور ملک راج آندھی شریک ہوئے۔ اسی دستور کو انجمن کی ایک نشست میں منظوری دی گئی جو لندن میں چیئرنگ کر اس روڈ سے متصل ”بان کنگ ریسٹورنٹ“ کے زیریں کمرے میں منعقد ہوئی تھی اور پھر آگے چل کر لکھنوں میں منعقدہ پہلی کافرنس میں بھی یہی دستور منظور کیا گیا۔ اس دستور کے اہم نکات یہ ہیں:

”ہندوستانی مصنفوں کا فرض ہے کہ جو نئے ترقی پذیر رجحانات اُبھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشوونما میں پورا حصہ لیں۔۔۔ ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنائیں اس روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لیے انسانیت اس دور میں کوشش ہے۔۔۔ ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہیں اس لیے زندگی کے جس شعبے میں رد عمل پائیں گے انہیں اختیار کریں گے۔۔۔ ہم اس انجمن کے ذریعے ہر اس جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکیوں کی تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، پستی اور توہین پرستی کی طرف لے جائے ہیں۔ ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوتِ تنقید کو ابھارتی ہیں اور سموں و اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔“ (۸)

یہ بہت پڑھو صلہ اعلان تھا۔ اردو ادب کی تاریخ میں ایسی آواز پہلے کبھی نہیں اٹھی تھی۔ اس منشور کے بعد لکھنو، الہ آباد اور پھر متعدد کافرنسوں میں اعلانات اور خطبوں کی شکل میں ”نیا ادب“ اور ”شاہراہ“ کے شماروں میں اس عزم کا بار بار اظہار کیا گیا۔ ادبی رجحانات پر تنقید کی گئی۔ آزادی اظہار، اپنے ادب، سماج اور تہذیب پر تنقید کی اہمیت پر خاص طور سے زیادہ زور دیا گیا۔۔۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قومی زندگی میں احتجاج کی لے بہت اونچی ہو گئی تھی۔ جلسے، مظاہرے، نعرے، روز مرہ زندگی کا دستور بن چکے تھے اور اس وقت کا ذہین و حساس مصنف اسی تلاطم کی اٹھتی ہوئی موج تھا چنانچہ ادب کی سطح پر بھی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہوئیں۔۔۔ قدیم ہنریوں سے نئے کام لیے گئے۔ نظم و نثر کی نئی ہنریوں کی تلاش میں عالمی ادب اور ہندوستان کے علاقائی ادب سے استفادہ کیا گیا۔ (۹)

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزان، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

ترقی پسند تحریک کی مقبولیت اور گھن گرج کا تمام ترا نحصار اس کے اساسی دستور پر تھا جو سائیکلوسٹائل کرو اکر اس کی کاپیاں ہندوستان میں ڈاکٹر محمد اشرف (علی گڑھ)، محمود اظفرا اور ان کی بیوی رشید جہاں (امر تر)، بیرن کمرجی (مکلتہ)، یوسف حسین خان (حیدر آباد)، ہٹھی سنگھ (بمبئی) وغیرہ کو بھیجیں گے تاکہ وہ اس کی بنیاد پر ہندوستان میں انجمن کی شاخیں قائم کر سکیں۔ اسی دوران سجاد ظہیر خود بھی ہندوستان والے آگئے اور اپنے والد کے ساتھ الہ آباد میں رہنے لگے اور اس طرح ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کا پہلا ہندوستانی دفتر الہ آباد میں احمد علی کے گھر پر قائم ہوا۔ سجاد ظہیر نے ایک طرف تو پریم چندر، جوش لیخ آبادی، مولوی عبدالحق جیسے مقتنز رادیبوں کو انجمن کا مسودہ دکھا کر ان کی تائید اور ہمدردی حاصل کی وہیں نوجوان ادیبوں کے ایک بہت بڑے گروہ کو اپنا ہم خیال بنالیا۔ ان میں فراق اور اعجاز حسین بھی تھے جو الہ آباد یونیورسٹی میں طالب علم تھے۔ علی سردار جعفری، جاں ثنا راختر، حیات اللہ الانصاری، مجاز، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، شاہد لطیف اور سبط حسن تھے جن کی بدولت علی گڑھ میں نئے ادبی رجحانات کا فروع ہو رہا تھا۔ فیض، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، میاں افتخار الدین، فیروز الدین منصور، سہیل عظیم آبادی، تمثائی اور اختر اور یعنی بھی تھے جن کی وجہ سے پنجاب و بہار میں ترقی پسند ادبی تحریک کے لیے زمین ہموار ہوئی۔ (۱۰)

کم از کم بر صغیر پاک و ہند کی سطح پر یہ پہلا موقع تھا کہ ادب کو زندگی سے مر بو ط کرنے کی بات کی گئی اور اسے مغلوں سے نکال کر جھوپنڑیوں تک لے جانے کا عزم کیا گیا۔ ادب کو انسانی استھان کے خلاف استعمال کرنے کی خوش آئند روایت کا آغاز کیا گیا۔ اس تحریک کو شروع سے ہی فعال حیثیت حاصل ہو گئی اور جلد ہی اس کا تحرک اور روزہ عمل دیکھنے میں آیا۔

ترقی پسند تحریک کی پہلی گل ہند کا نفرنس ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنو میں منعقد ہوئی جس کی صدارت مشی پریم چندر نے کی۔ اس کا نفرنس کی اہم بات خود مشی پریم چندر کا خطبہ صدارت تھا جس میں انہوں نے ادب کی دائیٰ قدر و حسن و صداقت، آزادی اور انسان دوستی کو اعلیٰ ادب کا جزو لایفک قرار دیتے ہوئے کہا کہ ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے، چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی، اسے ہماری حیات کا تمثہ کرنا چاہیے۔۔۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کے میزان پر توتا ہوں۔ بے شک آرٹ کا مقصد ذوقِ حُسْن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی ذوقی، معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو، مسرت خود ایک افادی شے ہے۔۔۔ ادیب کا مشن محض نشاط، محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے۔ وہ وطنیت اور سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔ (۱۱)

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

مشی پر یہ مچنے ترقی پسند تحریک کو توازن اور اعتدال کی راہ دکھائی اور انہوں نے ادب کا جو فطری نصب العین مقرر کیا تھا وہ معاشرے کے خارج اور فرد کے داخل کو یکساں طور پر متاثر کر سکتا تھا چنانچہ سید سجاد ظہیر نے اس صدارتی خطبے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ میرا بھی یہ خیال ہے کہ ہمارے ملک میں ترقی پسند تحریک کی غرض وغایت کے متعلق شاید اس سے بہتر کوئی چیز ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ (۱۲)

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء کا زمانہ ترقی پسند ادبیوں کے لیے ان کے عروج کا زمانہ رہا ہے۔ مخالفین کے حملوں اور انجمن کے اندر کی نظریاتی بحثوں کے باوجود ان برسوں میں ترقی پسندی ہندوستانی ادب کا غالب رجحان رہی اور ہندوستان کے بیشتر نامی گرامی ادیب اور نوجوانوں کا ایک غالب حصہ اس تحریک کے جلو میں آگے بڑھتا رہا۔ دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب ہر ہندوستانی چاہے وہ دانشور ہو یا مزدور، سیاست دان ہو یا کسان، طالب علم ہو یا جاگیر دار جذباتی طور پر ایک اکائی تھا اور ہر ایک کی منزل آزادی تھی۔ اپریل ۱۹۳۹ء میں جب انجمن کا اپنار سالہ "نیا ادب" "شائع ہوا تو اس کی ادارت کی ذمہ داری سب سطح حسن، مجاز اور علی سردار جعفری کو سونپی گئی۔ نیا ادب نے نہ صرف ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت کے فرائض سرانجام دیے بلکہ نوجوان ترقی پسند تحریک اور اس کے مقاصد سے آگاہ بھی کرایا اور اس طرح ترقی پسند تحقیق و تقدیم میں ان کی رہنمائی کی۔

۱۹۳۸ء کے وسط تک ترقی پسند تحریک نے لاہور، لکھنؤ اور حیدر آباد کن میں اپنے مرکز قائم کر لیے۔ اس عرصے میں اردو اور ہندی ادبیوں کی تین کافرنیس منعقد ہوئیں۔ تحریک کے نظریات کو فروغ دینے کے لیے ایک انگریزی سہ ماہی رسالہ "نیوانڈنیں لٹرچرچ" جاری کیا گیا۔ متعدد مقامات پر جلسے ہوئے۔ کسان کافرنیس میں اس تحریک کے مقاصد کی نشر و اشاعت کی گئی۔ ۱۹۳۸ء میں ملکتہ میں ایک گلہن کافرنیس منعقد ہوئی جس کا افتتاحی خطبہ رابندرناٹھ ٹیگور نے لکھا۔ ٹیگور کے خطبے میں مشی پر یہ مچنے کے نقطہ نظر کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ اس خطبے کی اہم بات یہ تھی کہ معاشرے کو جانا، سمجھنا اور اسے ترقی کی راہ دکھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سماج کی بخش پر انگلی رکھیں اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو ٹھوٹولیں۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب ہماری ہمدردیاں انسانیت کے ساتھ ہوں اور ہم ان کے درد و غم ہوں۔ (۱۳)

ترقبی پسند تحریک کے پہلے پانچ سال ادبی سے زیادہ تبلیغی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس عرصے میں ادب پر کم اور "ترقبی پسندی" پر زیادہ زور دیا گیا۔ (۱۴) ادب، ادیب اور سماج کے باہمی تعلق کے بارے میں مختلف سوال اسی دور میں اٹھائے گئے جس کی بازگشت بہت دیر تک ترقی پسندوں کی تحریروں میں سنائی دیتی رہی۔ اس تحریک کے زیر اثر یہ بات پہلی بار کہی گئی کہ سماج میں تبدیلیاں محنت کش طبقے کی حرکت و عمل سے آتی ہیں۔ گو کہ اس طبقے کا اب تک استھان ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ ادب کا کام

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزان، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

سماج کی ایسی تبدیلی میں حصہ لینا ہے جو انسانوں کے استھان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے، اور یہ بات بھی بالکل نئی تھی کہ ادب ان معنوں میں الہامی نہیں ہو سکتا کہ انسانی زندگی کے سیاق و سبق سے مطلق آزاد ہو جائے۔ ادب کی نشوونما سماجی عوامل کے زیر اثر ہی ہوتی ہے۔ اس نظریے کی بدولت اردو والے ایک نئی فکری جہت سے آشنا ہوئے۔ (۱۵)

ترقی پسند تحریک ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی تحریک بھی تھی۔ علی سردار جعفری نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ سیاست ہر جگہ ہے، ہر طرف ہے، فن اور ادب کی ہر تخلیق میں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کہیں سیاست ترقی پسند ہے اور کہیں رجعت پرست۔ جب فن پارے میں ترقی پسند سیاست ہوتی ہے تو فوراً انگلیاں اٹھتی ہیں کہ یہ فن نہیں سیاست ہے اور اگر سیاست رجعت پرست ہے تو وہ اعلیٰ درجے کا فن ہے، تفریح (Entertainment) ہے۔ (۱۶)

ادھر تحریک کے اہم ستون احمد علی نے کسی ادبی تحریک میں سیاسی نظریات کے فروع کو باعثِ انتشار قرار دیا تو وہ راندہ در گاہ ہو گئے۔ احمد علی کے اختلاف نے ترقی پسند تحریک کو دو دبستانوں میں تقسیم کر دیا، ان میں سے ایک دبستان نظریاتی اور سیاسی تھا جس کی نمائندگی سجاد ظہیر، علی سردار جعفری اور ڈاکٹر عبد العلیم کرتے تھے دوسرے دبستان غیر نظریاتی اور ادبی تھا اور اس کی نمائندگی احمد علی اور اختر حسین رائے پوری نے کی۔ تحریک کا سیاسی دبستان زیادہ منظم، فعال، سرگرم اور مستعد تھا اور اس نے مستقبل پر اثر انداز ہونے کی سعی کی۔ موئخ الدّکر دبستان غیر منظم اور منتشر تھا اور اس کے ادباء نے اپنی ادبی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے انفرادی سطح پر تخلیقی کام کیا۔ ان ادباء کے فن نے پریم چند کے خطبہ صدارت سے روشنی حاصل کی اور خارجی حقیقت کو جمالِ فن سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اوقل الذکر دبستان میں بالعموم وہ نوجوان شامل تھے جو ادب میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لیے مناسب موقع و محل کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ تحریک کے آغاز نئے ادب کا جو گروہ سامنے آیا ان میں سبیطِ حسن، کرشن چندر، حیات اللہ النصاری، خواجہ احمد عباس، اوپندر ناتھ اشک، سلام مجھلی شہری، مسعود اختر جمال، عصمت چفتائی، اختر انصاری دہلوی، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، احتشام حسین، محسن عبد اللہ، علی الطہر، شہاب ملحق آبادی، اسرار الحقیق مجاز، معین احسن جذبی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس دبستان نے تحریک کے ابتدائی ایام میں ملک کے بیش تر بڑے ادیبوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا لیکن جو نہیں اس تحریک کے نظریات کو فروع حاصل ہوا اور اس کے قدم جم گئے تو پرانے ادباء پس منظر میں چلے گئے اور ان کی جگہ نئے ادباء نے لے لی۔

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

ترقی پسند تحریک کے فروغ کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اسے نہ صرف آغاز میں نیاخون و افر مقدار میں مہیا ہو گیا بلکہ مرور ایام کے ساتھ اس میں مزید تازہ خون بھی شامل ہوتا گیا، چنانچہ ۷۶۹۲ء تک جو لوگ ادب کے مطلع پر نمودار ہوئے ان میں سے بیش تر کا تعلق ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہی تھا۔ چند اہم نام یہ ہیں: کیفی

اعظیمی، مگر تو نسوی، ساحر لدھیانوی، دیوبندر ستیار تھی، انور، ابن انشا، عارف عبد المتن، احمد ندیم قاسمی، ممتاز حسین، غلام ربانی تاباں، عبادت بریلوی، عبد اللہ ملک، مسلم

ضیائی، ابراءیم جلیس، نیاز حیدر، فارغ بخاری، شوکت صدیقی، انور عظیم، مطبلی فرید آبادی، سرلا دیوی، منیب الرحمن، ظہیر بابر، عزیز حامد مدنی، حمید اختر، ظہیر کاشمیری، مجر درح

سلطان پوری، قدوس صہبائی، مہمند رنا تھا، سلامت اللہ، عادل رشید، اخترا لایمان، بلوانت سلگھ، وشوامتر عادل، پنڈ راج رہبر، محمور جالندھری، حاجہ مسرور، خدیجہ

مستور، پرکاش پنڈت، اخترا انصاری اور نظر۔ انصاری وغیرہ۔ یہ لوگ ادب کی سب اصناف میں قلم آزمائی کرتے تھے تاہم ادباء کے اس انبوہ میں سب ادباء صفات اؤلے کے نہ تھے

اور جب وقت کا تناظر بدلتا تو اس میں بیش تر آسمان ادب کی پہنائیوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ (۱۷)

ترقی پسند تحریک کا دوسرا دروسی جنگِ عظیم سے آزادی حاصل کرنے تک پھیلا ہوا ہے۔ بڑھنے کی تاریخ کا یہ زمانہ شدید ترین سیاسی اور سماجی آویزش کا زمانہ تھا۔ جب

جنگِ عظیم چھڑی تو تحریک کو کیونٹ پارٹی کا حصہ سمجھ کر سجاد ظہیر، علی سردار جعفری اور عبد العلیم کو گرفتار کر لیا گیا چنانچہ تحریک تحطل کا شکار ہو گئی۔ جب سجاد ظہیر کو رہا

کیا گیا تو انہوں نے تحریک کو دوبارہ منظم کیا اور ۱۹۴۲ء کی دہلی کا نفرنس میں غیر ترقی پسند ادبیوں کے ساتھ ساتھ غیر ترقی پسند ادبیوں کے خلاف ہم آواز ہونے کے

نظریات کے لوگ شامل ہیں۔ اس کا نفرنس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ترقی پسند ادبیوں کے باور کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ تحریک میں ہر قسم کے

لیے مجتمع ہوئے تھے۔ خاص طور پر حلقہ اربابِ ذوق کا گروپ جو ادب میں افادیت سے مکمل تھا اور ترقی پسند ادب کی تحریروں کو پروپیگنڈہ کہتا تھا۔ اس گروپ کے اکثر ادبیں

انگلستان اور فرانس کے اشاریت پسندوں اور ہمیت پرستوں سے متاثر تھے۔ چنانچہ اس اجلاس میں جہاں ایک طرف سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم، سبط حسن، کرشن چندر، مجاز، سردار

جعفری اور رشید جہاں کا گروہ تھا تو دوسرا طرف راشد، میر احمدی، مولانا ناصلاح الدین احمد، قیوم نظر، مولانا عبد الجید سالک اور حفیظ جالندھری اس کا نفرنس میں شریک ہونے

کے لیے آئے تھے۔ (۱۸)

ترقی پسند تحریک نے وفاوتاً مختلف مقامات پر کا نفرنسیں منعقد کرنے کی جو طرح ڈلی تھیں اس نے تحریک کے مقاصد کو نشر کرنے میں بڑی مدد دی۔ اس تحریک کی پروپیگنڈہ

مشینری اتنی تیز تھی کہ نئے لکھنے والے اپنے آپ کو ترقی پسند تحریک سے والبستہ سمجھتے اور اس کا رکن بننے بغیر اسے اپنے حلقے میں فروغ دینے کی سمی کرتے۔ اس دور کے اہم

0300-5371884, 0344-5515779, 0345-7308411

سمسر: خزاں، 2021ء

کورس: اردو ادب کی تاریخ (6478)

ادبی رسائل مثلاً ادبی دنیا، ساقی، ہمایوں اور نیر گنگِ خیال وغیرہ میں جو ادب شائع ہو رہا تھا وہ مخزن، نگار، زمانہ اور معارف کے ادب سے یکسر مختلف تھا اور فرد کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے بجائے زندگی کے کھر درے عمل کو تہذیب آشنا کرتا تھا۔ تاہم ترقی پسندی کا سکھ اتنا مقبول ہوا کہ اس نئے ادب کو بھی ترقی پسند ادب کا حصہ شمار کیا گیا، چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ ترقی پسند تحریک کے فروع میں ربع چہارم کے نئے ادب نے بھی بالواسطہ طور پر معاونت کی اور دہلی کا نفرنس میں جب ملک بھر کے ادباء کی مشترکہ آواز اُبھری تو ترقی پسند ادبیں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ دہلی کا نفرنس نے ترقی پسند تحریک کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ (۱۹)

بر صغیر کی تقسیم کے ساتھ ہی ترقی پسند مصنفوں کی انجمان و حصوں میں بٹ گئی۔ ترقی پسند تحریک کا تیسرا دور آزادی کے بعد شروع ہوا جو اس کے لیے داغ داغ اجلا ثابت ہوا۔ پاکستانی ترقی پسندوں کی پہلی کا نفرنس منعقدہ ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء ادبی سے زیادہ سیاسی مقاصد لیے ہوئے تھی، چنانچہ ڈاکٹر تاشیر، مولانا صلاح الدین احمد، پطرس بخاری، میاں بشیر احمد، شیر محمد اختر، یوسف ظفر، قیوم نظر اور شورش کا شیری جو ترقی پسند نظریات سے متفق نہیں تھے ۲۶ ستمبر کے اعلان نامے سے الگ ہو گئے۔ حکومت نے سویرا، نقوش اور ادب لطیف وغیرہ جو تحریک کے ترجمان تھے، پر پابندی عائد کر دی۔ ادبی رسائل کی متذکرہ بندش کو ترقی پسند ادباء نے تحریک پر برادرست حملہ قرار دیا اور اس کے خلاف شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔ نومبر ۱۹۴۹ء کی پہلی کل پاکستان کا نفرنس میں نیا منشور منظور ہوا جو اشتراکی نظام کی بازگشت تھا۔ ۱۹۵۲ء میں اس منشور پر نظر ثانی کی گئی۔ اس منشور میں سیاسی عمل اختیار کرنے کے بجائے ادب کو فوقيت دی گئی۔ نیا منشور منظور کر لینے کے بعد بھی حکومت نے تحریک کی سیاسی حیثیت کو برقرار کھا چنانچہ جب ۱۹۵۳ء میں کیونٹ پارٹی پر پابندی لگائی گئی تو ترقی پسند تحریک بھی احتساب کی زد میں آگئی اور اسے بھی خلاف قانون قرار دے دیا گیا، تیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند تحریک کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔ جس طرح ہر عروج ایک زوال پر ملت ہوتا ہے اسی طرح ترقی پسند تحریک کو بھی زوال آکے رہا۔ اردو ادب کی اتنی اہم اور مقبول تحریک کے زوال اور مخالفت کی وجہات کی سرحدیں بھی آپس میں ملتی ہیں جن کا خود ترقی پسند دانشوروں کو احساس تھا، پروفیسر صدیق الرحمن قدوالی رقطراز ہیں:

”تحریک کی مقبولیت کے بعد کمتر صلاحیتوں کے لوگ بھی اسی دھارے میں بہنے لگتے ہیں۔ وہ اس قابلے سے الگ ہوتے ہوئے بھی اس میں شامل رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ منزل تحریک کے لیے اس لیے کھٹن ہوتی ہے کہ تحریک کے مقاصد جیسے جیسے حاصل ہونے لگتے ہیں اس کی چھتر چھایا میں بے سمت و وجهت ادب وجود میں آنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے خلاف احتجاج ہوتا ہے اور یہ احتجاج تحریک کی مخالفت کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو خود ادب میں ایک تحریک یا رحیم بن جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بھی یہ سب کچھ ہونا تھا اور ہوا۔“